دوسرے مسائل چھیڑ دیئے تو بھی کسی نہ کسی طرح مذہب کی بحث پھر اُبھر آئی۔ ہندوستان کے ایک نمائندے نے بتایا کہ مذہب کے معاملہ میں سب سے بڑی پیچیدگی یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام ایشیائی مذاہب کا نصب العین خالص روحانی نجات ہے جس سے لازماً یہ تصوّر پیدا ہوتا ہے کہ حیات موجودہ روح کے لئے ایک زندانِ الم ہے :

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

یہ تصوّرِ حیات موجودہ دنیا کے نصب العین سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ حیات جدیدہ اس تصور پر قائم ہے کہ اس دُنیا کی اصلاح و تزئین اور مادّی ترقی عین مقصودِ حیات ہے۔ کمیونزم اور دوسری کلیّت پسند تحریکات انسان کو اسی دنیا میں بہشت بریں کے لذائذ سے فیض یاب کر دینے کا سبز باغ دکھاتی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ عالمِ موجودہ کو انسان اپنی کوشش سے بدل سکتا ہے ایسی صُورت میں ہماری روایتی ایشیائی ثقافت ان تحریکات کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے۔

اس پر ایک اور ہندوستانی نمائندہ نے بتایا کہ یورپ میں تحریک نشاۃ ثانیہ کے بعد سے تاریخ میں ایک بالکل نئے باب کا اضافہ ہوا، جبکہ انسان کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ وُہ اپنی قسمت کی تشکیل خود کر سکتا ہے اور اس کے لئے کسی بیرونی یا غیر انسانی طاقت کا محتاج نہیں۔ اس انکشاف سے ایک نیا مادّی اور روحانی انقلاب وجود پذیر ہوا۔ کمیونزم بھی اسی عقیدہ کی پیداوار ہے جو نشاۃ ثانیہ کے بعد نمودار ہوا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان عالم کائنات کو مسخّر کر کے اپنی دُنیا آپ پیدا کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا چیلنج ہے جس سے مذہب یا مذہبی ایمان و عقیدہ کا احیاء عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مذہب کو اس سے انکار ہے کہ انسان تنہا اپنی کوشش سے زندگی کی تعمیر و اصلاح میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں مسٹر بروھی سابق وزیر قانون پاکستان نے فرمایا کہ کوئی ایشیائی مذہب خالص روحانی نجات کو مقصودِ حیات قرار نہیں دیتا اور نہ حیات دنیوی اور آخرت کی زندگی میں حدِّ فاصل قائم کرتا ہے۔ ان سب مذاہب کا دعویٰ صرف اتنا ہے کہ حیاتِ دنیوی کی اصلاح و ترقی زندگی کا واحد نصب العین نہیں۔ اور اس مادّی زندگی کے بعد بھی انسان کی ترقی اور کمال کا راستہ کھلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ایشیائی مذاہب معاشرتی زندگی کے انضباط کی غرض سے اخلاقیات کا ایک مکمّل نظام پیش کرتے ہیں جس سے ہماری مادّی زندگی کی اصلاح ہو سکے۔ بدھ مت جیسا مذہب بھی ایک عملی اخلاقی مذہب ہے جو انسان کے دنیوی فرائض پر زور دیتا ہے۔ دوئم خود کمیونزم جیسے نظام فکر میں بھی خالص روحانی اور غیر مادّی اقدار کا سراغ ملتا ہے۔ خالص مادّی بنیادوں پر یہ بات ناقابل فہم ہو جاتی ہے کہ ایک فرد کمیونزم کے لئے کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالے جبکہ بالآخر اسے کچھ حاصل ہونا نہیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ کمیونزم کی تحریک ناکام رہے یا وہ ایسے وقت کامیاب ہو جبکہ فرد مذکور اپنی زندگی ختم کر چکا ہو۔ لینن کی مثال دیتے ہوئے مسٹر بروھی نے سوال کیا کہ کمیونزم کے فروغ سے خود لینن کو کیا فائدہ ہوا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض مادّی اصلاح و ترقی کے محرک سے ہم ایک کمیونسٹ کے جوشِ عقیدت اور جاں نثاری کی توجیہہ نہیں کر سکتے۔ اس پر راقم الحروف نے عرض کیا کہ کمیونسٹوں کے پاس اس سوال کا جواب

موجود ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ افرادِ انسانی اتنے خود غرض اور نفس پرست نہیں۔ کہ وہ صرف ذاتی نفع و نقصان کو مدِ نظر رکھیں۔ انسان ایک معاشرتی ہستی ہے جو اپنے شخصی مفاد کے مقابلہ میں سوسائٹی کے اجتماعی مفاد کو زیادہ اہمیت دیتا دیتا ہے۔ بلکہ کمیونزم مذہب اور اہلِ مذہب کو اسی وجہ سے مورد الزام قرار دیتی ہے کہ وہ انسان کو ایک خود غرضانہ ہستی تصور کر کے اسے اپنی ذاتی نجات کی تلاش میں منہمک کر دیتے ہیں حالانکہ انسان فی الواقع اجتماعی اغراض و محرکات کا تابع ہے مگر کمیونسٹوں کا یہ استدلال درحقیقت ناقص ہے۔ انسان معاشرتی اغراض اور اجتماعی مفاد کو ضرور پیشِ نظر رکھتا ہے لیکن اپنی ذات اور نفس کو الگ کر کے نہیں۔ بڑے سے بڑے اجتماعی ایثار اور معاشرتی قربانی میں بھی فرد اپنے ذاتی شرف و امتیاز کو نہیں بھولتا اور نہ وہ کبھی کسی ایسے کام میں حصّہ لیتا ہے جس میں اس کی تسکین اور تکمیل ذات کا کوئی امکان نہ ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ مختلف افراد کی تسکین و تکمیل کے ذرائع اور اشکال مختلف ہیں۔

اس کے بعد جاپانی نمائندے نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ بعض مشرقی مذاہب مثلاً بدھ مت اور ہندو مت یقیناً عالمِ مادّی کی اصلاح سے بے تعلق معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ان میں بیک وقت مختلف اور متضاد میلانات ظاہر ہوتے رہے ہیں اور بعض میلانات انسان کی مادّی اصلاح اور ترقی حیات کے معاون تھے۔

جسٹس او چون نے برما کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ایک زمانہ وہ تھا بالخصوص ۱۹۴۹ء تک جب برما کی سرزمین کمیونزم کے لئے نہایت سازگار تھی۔ طالب علم اور پڑھے لکھے لوگ کمیونسٹ کہلانے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ لیکن آج صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ جو لوگ واقعتاً کمیونزم پر ایمان رکھتے ہیں وہ بھی اپنی مدافعت پر مجبور ہیں۔ اور کمیونسٹ کہلاتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس عرصہ میں برما کے عوام کا مذہبی احساس بیدار ہو گیا ہے۔ ان کا مذہب حیاتِ دنیوی اور مادّی کی نفی نہیں کرتا بلکہ انسان کو مرکزی اہمیت دیتا ہے۔ بدھ مت نہ تو انسان کی معاشی اور مادّی ترقی کا مخالف ہے اور نہ وہ قومی ترقی کی مختلف سرگرمیوں میں مزاحم ہوتا ہے۔

اس پر راقم الحروف نے عرض کیا کہ مذہب کا اصلی مسئلہ یہ نہیں کہ وہ زندگی اور ترقی سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا انحصار اس پر ہے کہ وہ ایجابًا زندگی کو کہاں تک آگے لے جا سکتا ہے۔ اگر مذہب کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ زندگی کی نفی نہیں کرتا اور ترقی کی راہ میں مزاحم نہیں ہے تو وہ ایک سلبی عقیدہ اور چند رسوم و شعائر کی حیثیت سے تو باقی رہ سکتا ہے لیکن ہمارے تمدنی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ مذہب کے مستقبل اور بقار کا دار و مدار اس پر ہوگا کہ آیا وہ زندگی کی اصلاح و تزئین اور معاشرتی ارتقاء میں کمیونزم یا دوسرے غیر مذہبی عقیدوں کی بہ نسبت زیادہ مؤثر ہے یا کم۔ کمیونزم نے اپنے پیروؤں کے اندر ایثار و قربانی کا جو جذبہ اور معاشرتی خدمات کا جو ولولہ پیدا کیا ہے۔ ہمیں اس کا بدل معلوم کرنا چاہیئے۔ اگر مذہب اس کا بدل فراہم کر سکتا ہے اور افرادِ انسانی کو جذبہ خدمت اور معاشرتی انصاف

کے حصول پر آمادہ کر سکتا ہے تب تو وہ ایک حقیقی طاقت ہوگا ورنہ محض چند عقیدوں اور رسمی عبادتوں کا مجموعہ بن کر رہ جائیگا دویم کمیونزم کے مقابلہ میں مذہب اسی وقت کام آسکتا ہے۔ جب وہ بہتر ثقافت اور اعلیٰ تر معاشرہ پیدا کر سکے۔ ایک خالص روحانی عقیدہ کی حیثیت سے جس کا عمرانی زندگی معاشرتی قوانین اور سماجی عدل و انصاف سے کوئی تعلق نہ ہو مذہب کی حیثیت صرف ایک دلچسپ تصوف کی رہ جاتی ہے۔ کمیونزم کے مقابلہ میں صرف وہی مذہب کامیاب ہو سکتا ہے جس کی بنیاد پر ایک بہتر سوسائٹی اور اعلیٰ تر ثقافت قائم کی جا سکے۔ اس طرح مذہب اور ثقافت کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس موقعہ پر مسٹر بروھی نے جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے حاضرین کو یاد دلایا کہ کانفرنس کو اس امر سے کوئی بحث نہیں ہونی چاہیئے کہ آیا مذہب کمیونزم کا مقابلہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا مذہبی احیاء کی تحریک سے انسانی ثقافت اور معاشرہ کو وہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ جن کا کمیونزم وعدہ کرتی ہے۔ فلپائن کے نمائندے نے جسٹس اوچان کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب ہر جگہ انسان کی حالت کو درست کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ میں ہر ملک کے لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے اندر ایک روحانی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ قدیم مذہبی عقائد کو ناکافی خیال کرنے لگے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بعض اوقات کمیونزم میں اپنی روحانی تسکین پاتے ہیں۔ فلپائن کے نمائندے نے دعویٰ کیا کہ اس نقطہ نظر سے بدھ مت اپنے اندر کچھ امید افزا پہلو رکھتا ہے کیونکہ بدھ مذہب خالص روحانی عقیدوں سے عبارت نہیں بلکہ وہ مادی زندگی سے بھی یکساں بحث کرتا ہے اور انسان کی مادی حالت کو سنوارنا چاہتا ہے۔ انھوں نے یہ خیال بھی کہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کی کامیابی میں یونانی علوم و فنون کے احیاء کا بہت بڑا دخل تھا۔ انسانیت دوستی (HUMANISM) کا عقیدہ یونانی علوم کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم انسانیت دوستی کے عقیدہ کو پھر ایک زندہ طاقت بنا دیں۔ کمیونزم بھی بظاہر انسانیت دوستی کے عقیدہ پر مبنی ہے لیکن وہ اس عقیدہ کی ابتدائی شرط یعنی حریت فکر و خیال کی تکمیل نہیں کرتی حالانکہ حریت و آزادی کے بغیر انسانیت دوستی ایک بے بنیاد تصور ہے۔

ہندوستان کے ایک نمائندہ نے کانفرنس کو یاد دلایا کہ کمیونزم کا مسئلہ نہ تو مادی ہے اور نہ منطقی۔ انھوں نے اس بات پر بطور خاص زور دیا کہ کمیونزم کے مسئلہ کو ایک نفسیاتی مسئلہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مذہب کی مانند کمیونزم بھی ایک غایتی (Teleological) فلسفہ ہے۔ اسی طرح وہ مادی ترقی اور طاقت کی بھی علمبردار ہے لیکن کمیونزم انسان کے حوصلہ اقتدار کی تشفی نہیں کر سکتی اور یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ اقتدار کو پھیلانے کی جگہ اسے چند لوگوں کی ذات میں مجتمع کر دیتی ہے۔ اور افراد انسانی کی اکثریت کو لذت اقتدار سے محروم رکھتی ہے حالانکہ ہر فرد معاشرہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کے اعتبار سے اقتدار و طاقت کا جویا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ تقسیم اقتدار میں اسے اس کا واجبی حصہ حاصل ہو۔ جسٹس اوچان کی تقریر کے حوالہ سے ہندوستانی نمائندہ نے بتایا کہ بدھ مت کے احیاء کی جو تحریک برما میں اس وقت

جاری ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدمت خلق کو اپنا نصب العین قرار دیتی ہے۔ اس لئے احیاء مذہب کی دوسری تحریکوں سے یہ تحریک مختلف ہے۔ (ہندوستانی نمائندہ کا منشاء غالباً یہ تھا کہ احیاء اسلام کی تحریکات میں معاشرتی خدمت کا جذبہ مفقود ہے) لیکن اس تحریک میں بھی ایک خطرہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کے خادم بسا اوقات ان کے آقا یا حاکم بن کر خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اس نوبت پر مسٹر سرور حسن نے اعتراض کیا کہ مذہب کی بحث بہت طویل ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا مسئلہ بالکل سادہ ہے اور وہ یہ ہے کہ کمیونزم انسانی آزادی کو بہت بڑی حد تک محدود کر دیتی ہے لیکن مذہب کے متعلق بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ انسانی آزادی کو محدود نہیں کرتا۔ مسٹر بروھی نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ لامحدود آزادی اپنی آپ نفی کرتی ہے۔ مذہب بھی آزادی کو محدود کرتا ہے لیکن کم سے کم مقدار میں دوئم مذہب جو تحدیدات عائد کرتا ہے ان میں سے بیشتر تحدیدات خارج سے نہیں آتیں بلکہ نفس انسانی انھیں اپنے اختیار اور مرضی سے اپنے اوپر عائد کرتا ہے۔

اس کے بعد چینی نمائندے مسٹر وانگ کے ایک مضمون پر بحث ہوئی۔ جو انہوں نے چینی علماء کی موجودہ حالت کے عنوان پر پیش کیا تھا۔ ہندوستان کے مشہور سوشلسٹ لیڈر مسٹر مسانی نے (جنھوں نے اب سوشلسٹ پارٹی سے استعفا دیدیا ہے) اس مضمون کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ غالباً ڈاکٹر وانگ نے چین کے اہل علم اور مفکرین کی نسبت ضرورت سے زیادتی کا اظہار کیا ہے کیونکہ اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ چینی کمیونسٹوں کی کامیابی کے باوجود آزاد چینی اہل علم کو اعتماد ہے کہ بالآخر آزادی کی طاقتوں کو فتح ہوگی اس لئے وہ مطلقاً مایوس نہیں بلکہ اپنی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اپنے مضمون میں ڈاکٹر وانگ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ چین کے مفکرین اور اہل علم پر ایسے حالات تاریخ میں اس سے قبل بھی گزر چکے ہیں جبکہ منچو سرداروں اور منگول قوم نے ان کے ملک پر ظالمانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اگر چینی اہل علم نے منچو اور منگول جیسے جابر حکمرانوں کا مردانہ وار مقابلہ کر لیا اور بالآخر کامیاب ہوئے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ موجودہ کمیونسٹوں کے مقابلہ میں پسپا ہو جائیں مسٹر مسانی نے کہا کہ ڈاکٹر وانگ نے ایک بہت بڑے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے وہ یہ کہ منچو حکمرانوں اور منگولوں کے دور میں انسان کی آزادی فکر کو دبانے کی کوئی کوشش عمل میں نہیں آئی اور نہ ان حکمرانوں نے وسیع پیمانہ پر تعلیم اور پروپگنڈے کے ذریعہ چینی دماغ کو بدلنے کی کوئی منظم جدوجہد کی۔ لیکن موجودہ کمیونسٹ چین اپنی ساری علمی اور فکری طاقت کے ساتھ نہایت وسیع پیمانہ پر چینی نوجوانوں کے ذہن بدلنے کی کوشش میں مصروف ہے اور انھیں اپنے افکار و خیالات اور عقائد کا اس طرح حلقہ بگوش بنانا چاہتا ہے کہ پھر کوئی دوسرا خیال ان کے دماغ میں راہ نہ پا سکے۔ مسٹر مسانی نے کہا کہ اگر ڈاکٹر چانگ کے مقدمات تسلیم کر لیے جائیں تو پھر چینی نوجوانوں کی آزادی فکر کو کوئی خطرہ درپیش نہیں، حالانکہ چین میں حریت فکر کا جس طرح گلا گھونٹا جارہا ہے، وہ نہایت خطرناک ہے۔ اور ہمیں اس کے خلاف ایک علمی اور عقلی محاذ قائم کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹر چانگ نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ چینی اہل علم باوجود مخالف حالات کے اپنی آزادئ فکر کو قائم رکھنے کی جدوجہد میں برابر مصروف ہیں اور کمیونزم کے پروپگنڈے اور جبری عقیدہ سازی کے باوجود ان کے دل میں آزادی

کی تڑپ موجود ہے چنانچہ انھوں نے پیکنگ کے ایک پروفیسر کا ذکر کیا جس نے ہانگ کانگ میں اپنے دوست کو ایک خط لکھا تھا اس خط میں چینی کمیونسٹ نظام کی بہت تعریف و توصیف کی گئی تھی، لیکن بین السطور پروفیسر موصوف نے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ چینی علماء اور اہلِ فکر ان تحدیدات سے ناخوش ہیں جو کمیونسٹوں نے ان کے افکار و خیالات پر عائد کر رکھی ہیں۔

اس کے بعد راقم الحروف نے مذہب اور کمیونزم پر تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ دُنیا بھر میں مذہبی احیاء کی ایک عالمگیر خواہش پائی جاتی ہے۔ برما میں بدھ مذہب کی تعلیمات کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں بھی لوگ اسلام کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔ بعض چینی اور جاپانی نمائندوں نے بھی اسی قسم کی تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ایک روحانی خلاء پیدا ہو گیا ہے اور گذشتہ دو صدیوں کی مبالغہ آمیز مادّہ پرستی نے انسان کی روحانی امنگوں کو کچل ڈالا ہے لیکن مذہبی احیاء کی تحریکات اسی وقت بار آور ہو سکتی ہیں جب وہ انسان کی مادّی ترقی اور اصلاح معیشت میں بھی معاون ہوں۔ ورنہ اگر ان تحریکات میں رجعت پسندانہ میلانات پیدا ہو گئے اور ان سے انسان کو معاشرتی عدل اور معاشی مساوات حاصل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی تو کمیونسٹوں کا یہ الزام صحیح ثابت ہو گا کہ مذہب عوام کے لئے بمنزلہ افیون ہے۔ اس لئے جو لوگ سیاسی میدان میں مذہب کا نام لیتے ہیں ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وُہ مذہبی اقدار کو سیاسی جمہوریت۔ معاشی مساوات اور معاشرتی عدل کی صُورت میں متشکل کر کے دکھائیں۔ اگر مذہب کو صرف ایک سیاسی نعرہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا اور اس سے انسانیت کو کوئی حقیقی فائدہ نہ پہنچا تو کمیونزم کو اور زیادہ فروغ ہو گا۔ مذہب اور کمیونزم کے تصادم میں مذہب کی کامیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ اس کے اصولوں کی بنا پر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل عمل میں آئے جس میں کمیونزم سے زیادہ معاشی عدل اور مغربی جمہوریت سے زیادہ سیاسی اور معاشرتی مساوات موجود ہو۔ ورنہ خالی عقائد کی بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ مذہب خالص عقائد کا نام نہیں بلکہ اپنے عقیدوں کو ثقافتی معاشرتی اور سیاسی اداروں کی شکل دینا چاہتا ہے۔ جب تک مذہبی عقائد کی بنا پر ایک ٹھوس اور محسوس و مشہود ثقافت کی تعمیر عمل میں نہ آئے اس وقت تک وہ کمیونزم کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ کمیونزم ایک مکمل معاشی اور ثقافتی نظام ہے، خالی خولی عقائد کا نام نہیں اور یہی اس کی طاقت کا سب سے بڑا راز ہے۔

اس کے بعد پروفیسر بارکھ کے مضمون پر بحث ہوئی جس میں پروفیسر موصوف نے بتایا تھا کہ ایشیا میں ثقافتی آزادی اور سیاسی جمہوریت کو کیا خطرات درپیش ہیں۔ پروفیسر موصوف نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ ایشیائی عوام کی جہالت۔ دورِ وسطیٰ کی ملوکانہ روایات اور تقدیر پرستی نے ان میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کر دی ہے جو ہر قسم کے جابرانہ اقتدار کو تسلیم کر لینے پر آمادہ رہتی ہے۔ ایشیائی عوام حاکمانہ اقتدار کو قضائے الٰہی کی طرح اٹل سمجھتے ہیں اور ہر ایسے نظامِ حکومت کی طرف فطری میلان رکھتے ہیں جس میں پدرانہ اور آمرانہ خصوصیات پائی جائیں۔ سیاست دانوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت اپنی خوشنما تقریروں اور وعدوں سے انھیں جمہوریت کی راہ سے ہٹا سکتی ہے۔ ان ثقافتی روایات کی وجہ سے ایشیائی قوم پرستی

اور اشتراکی آمریت کے درمیان ایک فطری ارتباط پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ ایشیائی قوم پرستانہ تحریکات لازماً جمہوری نظام حکومت کی علمبردار ہیں۔ ایشیا میں جمہوری آزادی کو ایک خطرہ اس وجہ سے بھی پیش آتا ہے کہ بیشتر ایشیائی ممالک میں سرمایہ اور فنی قابلیت کی کمی ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور جاپان سے قطع نظر کسی ایشیائی ملک میں فن دانوں اور صنعت کاروں کا کوئی آزادانہ طبقہ نہیں پایا جاتا۔ اس لئے ہر قسم کی معاشی اور صنعتی ترقی کے لئے افراد کو حکومت کا دست نگر رہنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے افراد کے مقابلہ میں حکومت کی طاقت کم ہونے کی جگہ بڑھتی جاتی ہے۔ حکومت اور عوام میں باہمی تعاون کا جذبہ مفقود ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عوام جاہل اور ان پڑھ ہیں اور ان کے معیارِ زندگی اور خیالات و افکار کو عمال حکومت کے معیارِ حیات اور افکار و خیالات سے دُور کی بھی نسبت نہیں۔ حکومتوں کی نافذ کردہ معاشی اسکیموں کی کامیابی بھی اسی وجہ سے مشکوک ہے کہ عوام میں اتنی سیاسی اور سماجی سمجھ بوجھ نہیں جو وہ کامل احساس ذمہ داری کے ساتھ ان کے فروغ میں اپنا واجبی حصہ ادا کریں۔ اس کے علاوہ ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کی جاری کردہ معاشی اسکیموں سے مرکزیت کی طرف میلان بڑھتا جائیگا۔ اور سیاسی طاقت و اقتدار ایک محدود طبقہ میں مجتمع ہو جائینگے حالانکہ جمہوریت کا اقتضا یہ ہے کہ عوام اور تعلیم یافتہ افراد حکومتی اقتدار میں مساوی طور پر شرکت کریں اور اپنے آپ کو سیاسی نظم کا ایک کارفرما عنصر محسوس کریں۔ پھر ایک مشکل یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم چند خاص طبقوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے جس کی وجہ سے دوسرے طبقوں کے افراد کو حکومت کے در و بست میں مساوی مواقع نہیں ملتے۔

پاکستان کے ایک نمائندے مسٹر سرور حسن نے پروفیسر یارکھ کے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان پیچیدہ مسائل کا حل یہ ہے کہ صنعتی میدان میں ایشیا مغربی ممالک کی تقلید نہ کرے بلکہ صنعتی ترقی کی رفتار اور صنعتی طریقہ کار کے انتخاب میں اپنے مخصوص حالات کو مدنظر رکھے۔ مسٹر سرور حسن نے یہ بھی فرمایا کہ ایشیا کو ایک وحدت تصوّر کرنا غلط ہے۔ مثلاً جاپان کو مشکل ہی سے ایشیائی ممالک کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایشیا ایک ایسی حقیقت ہے جو جاپان میں کچھ ہے ہندوستان میں کچھ اور مصر و شام میں کچھ اور۔ جاپان تہذیب جدید کے وسائل سے متمتع ہونے میں کامیاب رہا۔ لیکن دوسرے ایشیائی ممالک میں جاپانی طریقوں سے تہذیب جدید کے وسائل کو فروغ نہیں دیا جا سکتا۔ ہر ملک کو صنعتی ترقی کے لئے مختلف طریقے اختیار کرنے پڑینگے۔ مقرر کا منشا غالباً یہ تھا کہ ہر قوم کی ثقافت اور کلچر مختلف خطوط پر ترقی کر سکتے ہیں مثلاً جاپان نے مغرب سے بہت کچھ لیا لیکن نہ اس نے اپنی زبان چھوڑی اور نہ اپنا رسم الخط۔ اتنی محیر العقول ترقی کے باوجود جاپان کا سارا علمی سرمایہ اس کی اپنی زبان میں ہے اس کی تجارت صنعت و حرفت غرضکہ تمام قومی سرگرمیوں میں جاپانی زبان استعمال کی جاتی ہے، حالانکہ اس زبان کا رسم الخط بہت پیچیدہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قومی زبان کی ترویج اور جامعات اور علمی درسگاہوں میں اس کا فروغ قومی ترقی کی ایک لازمی شرط ہے۔ غرضکہ کلچر اور ثقافت کی گوناگونی اور اختلاف ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

کانفرنس کے آخری روز ہندوستان کے مشہور لیڈر مسٹر جے پرکاش نرائن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ ایشیا کے مختلف ممالک کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر جدا ہے اور ہر ملک کے اپنے مخصوص مسائل ہیں لیکن ایشیائی ممالک بعض مشترک مسائل اور مشترک تاریخی تجربات بھی رکھتے ہیں۔ اگر یہ تمام ممالک انہیں بنیادوں پر اپنی تعمیر شروع کریں جو فی الوقت موجود ہیں تو ناکامیابی زیادہ یقینی ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ کوئی نئی بنیاد تلاش کریں مسٹر جے پرکاش نرائن نے ان اصحاب سے اتفاق کیا جو ایشیا کی تعمیر میں مذہبی عقائد و احساسات کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ ہمارے مذاہب میں روایت پرستی اور رسوم پرستی کے جراثیم داخل ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی ایشیا میں مذہب کی گرفت بہت مضبوط ہے اور یہ خیال غلط ہے کہ اس کا اثر صرف رسمی عقائد و شعائر یا عبادت کے ظاہری طریقوں تک محدود ہے۔ اس وجہ سے ہمیں نا امید ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ایشیا کے سیاسی اور علمی لیڈر اس امر کی منظم جدوجہد کریں کہ لوگ جن عقائد اور اخلاقی اقدار پر ایمان رکھتے ہیں ان کا صرف زبانی اقرار ہی نہ کریں بلکہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان پر واقعتاً عمل پیرا ہو جائیں تو ثقافتی آزادی کا حصول دشوار نہ ہوگا۔ آگے چل کر مسٹر جے پرکاش نرائن نے بتایا کہ ان کے خیال میں موجودہ زندگی کا سب سے تاریک پہلو یہ ہے کہ مذہبی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی زندگی کے دائرے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو گئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ان مصنوعی حد بندیوں کو توڑ کر زندگی کو ایک وحدت بنایا جائے۔ کیونکہ آئندہ وہی تحریکات کامیاب ہو سکتی ہیں جو معاشی، سیاسی اور تمدنی زندگی ..... کو مذہبی اور اخلاقی اقدار سے ملا جلا کر کام لیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے ملک یعنی ہندوستان میں اس قسم کی ایک کوشش کی جا رہی ہے۔ لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ مذہبی اور اخلاقی بنیادوں پر اپنے معاشی اور تمدنی مسائل کا حل تلاش کریں۔ اس لئے صحیح اور قابلِ عمل طریقہ صرف یہ ہے کہ ہر قوم کے افراد سے کہا جائے کہ وہ اپنے معاشی اور عمرانی مسائل کا مذہبی اور روحانی اقدار سے رشتہ جوڑ کر ان کا حل معلوم کریں۔ زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کی بجائے اس کی وحدت قائم کرنے سے میری یہی مراد ہے۔ مذاہب کو رسم پرستی اور روایت پرستی سے صرف اسی طور پر آزاد کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر نرائن نے یہ بھی فرمایا کہ اگر افراد کی قلب ماہیت نہ ہو تو تمام ادارہ جاتی اور سماجی تبدیلیاں عارضی ثابت ہوں گی۔ کوئی انقلاب دیرپا نہیں ثابت ہو سکتا جس میں فرد کی اہمیت نظر انداز کر دی جائے اور اس کے خیالات و اقدار تبدیل نہ کئے جائیں۔ تاریخ میں ہمیشہ مذہبی رہنماؤں نے فرد کی روحانی تعلیم و تربیت سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ لیکن بدھ مت اور اسلام کے ایک مختصر دور کو چھوڑ کر مذہبی رہنماؤں نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ وہ اس روحانی تربیت اور اخلاقی تعلیم کو زندگی کے مادی اور معاشرتی مسائل پر منطبق کریں۔

کانفرنس کے آخری روز ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ مسٹر ڈاکاسٹا ایڈیٹر ایسٹرن اکانومسٹ نے اپنے مضمون کے بارے میں بحث شروع کی۔ یہ مضمون جنوب مشرقی ایشیا کی معاشی ترقی سے متعلق تھا۔ اس میں مسٹر ڈاکاسٹا نے کولمبو منصوبہ (Colombo Plan) پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس منصوبہ میں مختلف ایشیائی قومی منصوبوں کو بطور ایک امر واقعہ تسلیم کر لیا

گیا ہے اور اس امر کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ ان میں باہم ربط و توافق پیدا کیا جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ایشیائی ملک اپنی معاشی منصوبہ بندی صرف اپنے محدود قومی نقطۂ نظر سے کریگا اور جنوب مشرقی ایشیا کے مجموعی مفاد کو پیش نظر نہیں رکھے گا۔ اس طرح ایشیائی ممالک میں باہمی تعاون کی کوئی صورت نہیں پیدا ہوگی۔ کولمبو منصوبہ پر ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ جب اس منصوبہ کا پہلی مرتبہ آغاز کیا گیا تو خیال یہ تھا کہ ایشیائی معیشت جامد اور غیر متحرک ہے۔ یہ بھی خیال تھا کہ جمود کو توڑنے کیلئے سرمایہ و فنی مہارت کی فراہمی ضروری ہوگی۔ لیکن ہندوستان نے صنعت اور زراعت کے میدانوں میں جس حرکت پذیری کا ثبوت دیا اس سے کولمبو منصوبہ کا یہ مفروضہ باطل ہوگیا کیونکہ ہندوستان نے بیرونی سرمایہ اور بیرونی ماہرین فن کی امداد کے بغیر صنعت اور زراعت دونوں شعبوں میں بے انتہا ترقی کرلی ہے۔ آخر میں مسٹر ڈاکاسٹانے بین العلاقائی تجارتی معاہدوں کی اہمیت پر زور دیا۔ مسٹر ڈاکاسٹا کا خیال یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک اپنے آپ کو ایک معاشی وحدت متصور کریں۔ اور ہر ملک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ تجارتی معاہدے کرے جن کا منشا یہ ہو کہ وہ اپنی ضرورت کی اشیاء جنوب مشرقی ایشیا کے باہر سے خریدنے کے بجائے اسی علاقہ سے خریدے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ایشیائی ممالک معاشی حیثیت سے خود مکتفی ہونے کی کوشش سے دستبردار ہو جائیں۔ مثلاً ہندوستان برما کے چاول کا مستقل خریدار بن جائے اور اس کے معاوضہ میں برما ہندوستان کے کارخانوں کا تیار کردہ کپڑا خریدا کرے۔ اسی طرح ہندوستان اپنے ربڑ کی ضروریات کے لئے سیلون کا بازار استعمال کرے اور اس کے معاوضہ میں سیلون ہندوستان سے انجینئرنگ کی مصنوعات خریدا کرے۔ برما، سیلون اور انڈونیشیا کی باہمی تجارت میں بھی اسی اصول کو پیش نظر رکھا جاسکتا ہے کیونکہ سیلون اور انڈونیشیا دونوں کو برما کے چاول کی ضرورت رہتی ہے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی باہمی تجارت اتفاقی ضروریات پر مبنی ہے اور اس میں کسی خاص اصول یا منصوبہ کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ہر ملک جہاں سے چاہتا ہے اپنی ضروریات پوری کرلیتا ہے۔ اس لئے اب اس باہمی تجارت میں باقاعدگی پیدا کرنے کیلئے ایک تجارتی بورڈ قائم کیا جائے جس میں تمام جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کے نمائندے شریک ہوں اور پھر آپس کی گفت و شنید اور مباحثہ کے بعد باہمی تجارتی معاہدے عمل میں لائے جائیں۔

مسٹر ڈاکاسٹا کے اس مضمون پر سیلون کے نمائندے نے سخت اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ اوّل تو یہ مضمون کانفرنس کے موضوع سے غیر متعلق ہے۔ کیونکہ یہ ایک ثقافتی کانفرنس ہے نہ کہ معاشی کانفرنس۔ دوئم اس مضمون کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان دوسرے ایشیائی ممالک کے مقابلہ میں وہی حیثیت اختیار کرلے جو اب تک یورپ کو حاصل رہی ہے یعنی ہندوستان دوسرے ایشیائی ممالک سے خام پیداوار حاصل کرکے اپنی صنعتوں کو فروغ دے اور دوسرے ممالک اپنی صنعتوں کو ترقی دینے کے بجائے ہندوستان کی صنعتی پیداوار کے مارکیٹ بن جائیں۔ اس طرح سارے ایشیائی ممالک پر ہندوستان معاشی غلبہ حاصل کرلے گا۔ سیلون کے نمائندے کے احتجاج پر مسٹر ڈاکاسٹا نے اپنا مضمون واپس لے لیا اور کانفرنس نے طے کیا کہ یہ مضمون اس کے موضوع بحث سے خارج ہے۔

محمد عثمان صاحب ایم۔ اے

معاشی انصاف کی ضرورت

اقبالؒ نے آج سے کم وبیش بیس برس پہلے یہ شعر کہا تھا:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

تب سے "روحِ محمدؐ" کا تصوّر بدلا ہو کہ نہ بدلا ہو "فاقہ کشی" کا نظریہ یقیناً بدل چکا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دنیا کی معمولی آسائش اور زندگی کی عام ضروریات کی خواہش کرنا جذبۂ دینداری کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ اور بھوکے ننگے رہ کر نماز روزے کی پابندی انتہائی نیکی تصوّر ہوتی تھی۔ اس صورتِ حالات اور اندازِ نظر کے تین اسباب تھے: اوّل یہ کہ صدیوں سے غربت کی زندگی بسر کرتے کرتے عوام اس کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ اچھی اور خوشحال زندگی کی آرزو بھی ان کے احاطۂ خیال سے باہر تھی۔ دوم، جاگیردار اور دولتمند طبقے نے کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر عوام کو افلاس کی زندگی پر مجبور کیا۔ سوم، روشن خیال علماء کے ایک محدود طبقے کو چھوڑ کر مذہبی پیشواؤں کی اکثریت نے کہیں خلوصِ نیّت سے اور کہیں مفاد پرستی کی بنا پر مذہب کو کچھ ایسے رنگ میں پیش کیا کہ غفلت شعار عوام اپنی دنیوی بہبود سے اور بھی غافل ہو گئے۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی میں ہماری قومی زندگی نے کئی کروٹیں لیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے افکار و خیالات کا چرچا ہوا۔ سیّد احمدؒ اور سیّد اسمٰعیلؒ کے جذبۂ جہاد نے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ سر سیّدؒ کی قیادت میں نئی تعلیم کا خیر مقدم کیا گیا۔ تحریکِ خلافت نے اسلامی اخوّت اور حریّت پسندی کی ایک نئی روح پھونک دی، اور سب سے آخر میں اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی رہنمائی میں قوم نے متحد ہو کر پاکستان کا مطالبہ کیا اور اسے حاصل کر لیا۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر معاشی اعتبار سے جو تجزیہ میں نے اوپر پیش کیا ہے اس کے دروبست میں بال برابر فرق نہ آیا۔ ہندوستان میں بسنے والی مسلمان قوم تعلیمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی میدان میں آہستہ آہستہ سہی برابر بڑھتی چلی گئی مگر اقتصادی لحاظ سے اس کے ڈھانچے میں کسی خوشگوار تبدیلی کا آنا تو درکنار، اس کی ضرورت تک کو تسلیم نہ کیا گیا۔ معدودے چند گھرانے جو صدیوں سے بڑی بڑی زمینداریوں کے مالک اور جاگیروں کے قابض تھے، وہ وقت کا ساتھ دیتے رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی دولت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس برادری میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے۔ جو نئی تعلیم پا کر ذاتی قابلیت اور محنت سے یا ابن الوقتی سے ترقی کر سکے۔ باقی کروڑوں افراد زندگی اور موت کی دائمی کشمکش میں مبتلا رہے۔ وہ قوم کی ہر سیاسی تحریک میں شامل ہو کر ایثار و قربانی کا ثبوت دیتے رہے مگر ان کیلئے کسی نے ایثار و قربانی کو ضروری نہ سمجھا!

مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ اسے جدید علوم کی برکت کہئے یا دوسرے ملکوں کے عوام کی بیداری کا اثر سمجھئے یا اسے سچے اور حقیقی اسلام کی طرف لوٹنے کے جذبہ سے تعبیر کیجئے، بہر حال اب ملک میں ہر طرف سے یہ آواز آ رہی ہے اور ہر جاننے بوجھنے والا شخص اسے تسلیم کر رہا ہے کہ اگر ملک کو مضبوط بنانا ہے، اگر اپنی آزادی اور سالمیت کو برقرار رکھنا ہے، اگر قوموں کی برادری میں عزّت کی جگہ

حاصل کرنی ہے اور دنیا میں ایک زندہ اور فعّال قوم کی حیثیت سے جینا ہے تو سب سے پہلے عوام کی حالت کو بہتر بناؤ، ان کی تیرہ بختی کا علاج ڈھونڈو اور ان کے بھیانک افلاس کو دُور کرو۔ آج شاید ہی کوئی شخص آپ کو نظر آئے، جو ضروریات زندگی کی خواہش کو عرس و آزکہہ کر شانِ توکّل اور جذبۂ دینداری کے خلاف قرار دے۔ آج ملک کے دنیادار اور مادّہ پرست ہی نہیں، مذہب و اخلاق کے علمبردار بھی اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ عوام کی خوشحالی روحانی قدروں کے فروغ کے لئے بھی اسی قدر شرطِ اوّل ہے جس قدر کہ مادّی قوت کی ترقی کے لئے عوام کا تسلّی بخش معیارِ زندگی: ان کی غربت، جہالت اور بیماری کے گھٹاٹوپ اندھیرے سے نکال کر آسودگی، علم اور صحت کی جانفزا روشنی میں لانے کا کام ہماری تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں میں سرفہرست ہونا چاہئے۔ یہ کام سب سے اہم ہے، سب سے بنیادی ہے۔ جب تک یہ نہ ہوگا زبان سے اخلاق و دیانت کے لاکھ چرچے برپا ہوں۔ قلم سے روحانیت اور پاکیزگی کے ہزار دلفریب نقشے کھینچے جائیں اور لا الٰہ کے نعروں کی گونج گرجے میں خواہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ قومی اخلاق، قومی کردار اور اس اعتبار سے قومی طاقت کی موجودہ قابلِ افسوس حالت میں ذرّہ بھر بہتری کی صورت پیدا ہونا ناممکن ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس بنیادی کام کو کس طریق سے انجام دیا جائے؟ بظاہر ہمارے سامنے دو راہیں کشادہ ہیں۔ ایک راہ وہ ہے جو روس کے عوام نے اپنی جمعیّت، تنظیم اور انقلاب پسندی کی بدولت ہموار کی۔ دوسری وہ جو امریکہ اور برطانیہ کی دُور اندیشی، استعمار پسندی اور میانہ روی سے پیدا ہوئی۔ ہم میں سے کئی ایسے ہونگے جو پہلی راہ کو اختیار کرنے پر زور دینگے اور ہمارے موجودہ معاشی مسئلے کو روسی اشتراکیت کی روشنی میں حل کرنے کی سفارش کریں گے۔ بہت سے لوگ مغربی طاقتوں کے نظامِ معاشی سے رہنمائی حاصل کرنے کے حامی ہونگے۔ انھیں روسی اشتراکیت میں خطرے دکھائی دیں گے اور امریکہ اور برطانیہ کی اعتدال پسندی اور انفرادیت نوازی میں فائدے نظر آئیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نہ روسی اشتراکیت کی راہ اختیار کر سکتے ہیں اور نہ امریکہ اور برطانیہ کے معاشی نظام کو اپنانے کے قابل ہیں۔ سطحی نظر میں دونوں طریقے بڑی جاذبیت اور کشش کے حامل ہیں۔ ہمارے لئے امریکہ کے عوام کا معیارِ زندگی بھی قابلِ صد رشک ہے اور روس کے عوام کا بھی، لیکن کسی راہ کو اختیار کرنے کے لئے محض اس کی کشش اور اس کے دلربا مناظر کی دلفریبی کافی نہیں۔ چلنے سے پہلے دو اُمور کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ اپنی ساری توانائی اور عزم و ہمّت سے کام لیکر ہم جس منزل پہ پہنچنے والے ہیں وہ کیا ہے، کیسی ہے اور ہمیں اس کے حصول کیلئے کیا قیمت ادا کرنی پڑیگی؟ دوم یہ کہ اپنی تمام توانائی اور عزم و ہمّت کے باوجود ہم اس منزل پہ پہنچ بھی سکیں گے؟

جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے میرے خیال میں یہ سودا ہمیں بہت مہنگا پڑیگا۔ جہاں تک مغربی نظامِ معاش کا تعلق ہے ہمارے وسائل ایسے نہیں ہیں کہ ہم اس کی کامیاب پیروی کر سکیں۔ وقت کا فیصلہ بھی اس کے خلاف ہے۔

سب سے پہلے میں اشتراکیت کو لیتا ہوں۔ آج سے صرف چالیس برس پہلے روس میں عوام کی حالت بہت ابتر تھی اور ملک کی دولت اور وسائل پر صرف چند جاگیردار، منصب دار اور سرمایہ دار قابض تھے۔ کسان اور مزدور جن کی تعداد ۹۵ فیصدی سے زیادہ تھی صدیوں سے زار اور اس کے امراء کا ظلم سہہ رہے تھے۔ وہ حیوانوں کی طرح کام کرتے اور حیوانوں سے بدتر زندگی کے حقدار ٹھہرتے۔